بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انسانم آرزوست

(انسانوں کی تلاش!)

محترم پرویز صاحب کا پانچ سال پہلے کا خطاب، آج جس کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ ہے

عزیزانِ من! اس خطاب میں، میرے پیشِ نظر اس تباہی کا دلسوز اور جگر خراش تذکرہ ہے جو نہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود ہے اور نہ کسی خاص قوم یا مملکت سے مخصوص۔ یہ اس جہنم کا جاں سوز

عالمگیر فساد

تذکرہ ہے جس میں آج پورے کا پورا عالمِ انسانیت جھلس رہا ہے۔ اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اپنے سامنے نہیں پاتا۔ قرآنِ کریم نے اپنے زمانۂ نزول کی عالمگیر تباہی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۳۰/۴۱)

کرۂ ارض پر خشکی اور تری میں، ہر جگہ فساد برپا ہے۔ اور یہ سب، لوگوں کا اپنا کیا کرایا ہے۔ اس کے ذمہ دار خود ان کے خود ساختہ نظامِ حیات ہیں۔

اُس زمانے میں، دنیا میں روم اور ایران کی دو سب سے اہم تہذیبیں تھیں۔ اور یہ دونوں پستیٔ اخلاق و کردار کے جن عمیق گڑھوں میں گر چکی تھیں، ان پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ لیکن دنیا کی جو حالت آج ہو چکی ہے، اس میں اِس فساد کی وسعتیں حدود فراموش اور طغیانیاں ساحلِ ناآشنا ہیں۔ آج، وسائلِ رسل و رسائل کی عمومیت اور ذرائعِ مواصلات و ابلاغ کی عالمگیریت نے، ساری دنیا سمٹ کر، ایک قطعۂ ارض بن گئی ہے جس میں ان انسانیت سوز خرابیوں کے جراثیم وبائی امراض کی شکل اختیار کر چکے ہیں، جن سے اس کا کوئی کونہ کھدرا تک محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قرآنِ کریم نے ایک آنے

والے دور کے متعلق کہا تھا کہ

كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيْرًا (۷۶/۷)

اس میں شر کی چنگاریاں فضا میں اڑتی پھریں گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ہمارے ہی دور کی طرف اشارہ ہے جس میں، اقبالؒ کے الفاظ میں کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ——— شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب ——— مشرق و مغرب سب اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ اس میں حالت یہ ہے کہ ——— عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ ——— اور اس کی وجہ سے، یا یوں کہئے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ——— نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری ——— بہرحال یہ ہے وہ عالمگیر تباہی کا جہنم جس میں آج ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ کسی کو نہ دکھائی دیتی ہے نہ سجھائی۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا اس قسم کا منظر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے کہا تھا کہ ؎

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے!

بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

یورپ کا واویلا

یہ آج سے کوئی چالیس پینتالیس سال پہلے کی بات ہے۔ لیکن اس کے بعد، یورپ کے جراحت ہائے پنہاں کے درد کی شدت اس قدر بڑھ گئی کہ اس کی چیخ و پکار نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد رابرٹ برفو نے لکھا تھا کہ

یہ جنگ، مع اپنے تمام بہیمانہ مظاہروں کے جن کی وجہ سے آج ہمارا شعور گوناگوں دہشت انگیزیوں کا مسکن بن رہا ہے، کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یہ تمام مجرمانہ حماقتیں، تمام منافقتیں، تہمت تراشیاں اور دروغ بافیاں، یہ تمام سنگدلانہ حرکات، انسانی زندگی اور قوت اور دولت کی یہ تمام بربادی اور دہشت انگیز تباہی، غرضیکہ یہ پورے کا پورا پاگل پن اور اس کا ایک ایک عنصر، ہماری قبل از جنگ کی مغربی تہذیب کے اندر موجود تھا۔ جنگ دراصل ان تمام مذموم افعال اور نفرت انگیز اعمال کا مرئی اوتار یا محسوس مظاہرہ تھا جن کی مسموم فضا میں ہم گھرے ہوئے تھے۔ جنگ نے صرف اتنا ہی کیا کہ ان بھیانک چہروں سے نقاب الٹ دیا۔

(THE MAKING OF HUMANITY)

اسی دور کے ایک ماہر تجزیۂ نفس، ڈاکٹر ولیم سٹیکل نے لکھا تھا:-

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جرائم عام ہو چکے ہیں۔ چوری ایک مہذب ہنر بن چکی ہے، صرف اس کا نام بدل دیا گیا ہے۔ اب اسے کاروبار (بزنس) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ قتل ایک عام بات ہو چکی ہے۔ سرمایہ شہنشاہِ مطلق ہے۔ جنگ سے سہل انگاری

عام ہو چکی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ کسی طرح مفت میں دولت ہاتھ آجائے اور کام نہ کرنا پڑے۔ اخلاق کا معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ معاشرہ کی شرم کا اب احساس تک نہیں رہا۔ اب شرم صرف اسے آتی ہے جو دوسروں کا خون چوسنے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ جنگ کے بعد قمار بازی کا چسکا عام ہو گیا ہے حتیٰ کہ اب وہ جنون کی کیفیت اختیار کر چکا ہے۔ جوئے کی سینکڑوں مہذب قسمیں ایجاد ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شراب خوری۔ اس سے بوڑھے، بچے سب کی قوتِ عمل تباہ ہو جاتی ہے۔ اور لوٹ مار، اور تباہ کاری کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ (PECULIARITIES OF BEHAVIOUR)

آپ غور کیجئے عزیزانِ من! اگر ہمیں یہ نہ بتایا جاتا کہ اس میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد، اقوامِ مغرب کا نقشہ کھینچا گیا ہے، تو آپ یہی سمجھتے کہ یہ خود ہمارا تذکرہ ہو رہا ہے! بہرحال اس اخلاقی پستی کا آغاز پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ہوا۔ اور جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد، یہ خرابیاں انتہائی شدت اختیار کر گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں لارڈ سنٹل کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی (THE NEW WORLD) اس میں اس نے لکھا تھا:۔

نوعِ انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ اسے برباد بلکہ فنا کر دے گا۔ یوں تو انسان کی طول و طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سے وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے۔ پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ جنگ ہوتی تھی تو کسی خاص مقصد کے لئے ——— کبھی خام پیداوار کے لئے ——— کبھی خام مال کی منڈیوں کی تلاش میں۔ کبھی دفاعی مُوقف کی غرض سے۔ لیکن گذشتہ جنگ کو دیکھئے۔ اس کی ظلمت انسانی قلوب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی ——— نسلی تفاخر، تغلب و تسلط کے جذبات اور مملکت کے متعلق غلط فلسفہ۔

لہٰذا جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زورآور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانہ پر افلاس، امراض اور اموات کے شیاطین منڈلا رہے ہیں، . . . . نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔

یہ تو ہے انسانی معاشرہ کی اجتماعی تباہ کاریوں کا تذکرہ۔ اس معاشرہ کے اندر خود فرد کی کیا حالت ہے۔ اس کے متعلق مشہور امریکی مفکر ممفورڈ لکھتا ہے کہ

ہم تاریخ میں اس مقام پہ پہنچ چکے ہیں جہاں انسان خود اپنا بدترین دشمن بن چکا ہے...... مغربی کلچر انسان کا ترجمان نہیں رہا۔ یہ انسان سے باہر کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور خود انسان کا دشمن ہے....... اس تہذیب کے خلاف اس سے شدید تر تنقید اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ علاوہ اس کے کہ اس کے ذریعے انسان اپنے اوپر آپ تباہیاں لا رہا ہے، اسے انسانی زندگی سے کچھ دلچسپی نہیں رہی۔

اس تہذیب کا ماحصل یہ ہوگا کہ اس قسم کے مشینی انسان پیدا ہوں گے جو نہ اپنے لئے آپ فیصلہ کر سکنے کے قابل ہوں گے اور نہ ہی زندگی کی شاہراہ متعین کر سکنے کے اہل۔

(THE CONDUCT OF LIFE)

ہمارے زمانے میں، علمِ تجزیۂ نفس (PSYCHO ANALYSIS) انسان کی اندرونی دنیا سے متعلق مسائل کی بنیادی وجوہات کے سلسلہ میں بڑی تحقیق کر رہا ہے۔ اس فن کے مشہور ماہر ڈاکٹر ینگ نے ہزارہا مریض نوجوانوں کے تجزیۂ نفس کے بعد ایک کتاب لکھی (MODERN MAN-IN SEARCH OF SOUL) وہ اس کتاب میں لکھتا ہے:-

عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ سے ہراساں۔ یعنی ان وحشی قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور سے قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت۔ اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے جہاں تخریب و تعمیر کی قوتیں ہر وقت ترازو کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

یہ وہ تاریکیاں ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے، ابلیس کی زبان سے کہلوایا تھا کہ

تو نے کیا دیکھا نہیں، مغرب کا جمہوری نظام چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

خود اقبالؒ نے اس بدنصیب انسان کے قلبی اضطراب کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:-

وہ اپنے فکر کی دنیا میں خود اپنی ذات کے خلاف ستیزہ کار رہتا ہے، اور سیاسی دنیا میں دوسروں کے خلاف نبرد آزما ——— اور نہ اپنی کف بدہاں سرکشی کو ضبط میں لا سکتا ہے، اور نہ ہی ہوسِ زرپرستی کی ناقابلِ تسکین تشنگی کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا۔ ..... یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کے تمام بلند مقاصد کو (ایک ایک کر کے) تباہ کر رہی ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر رہی ہیں کہ وہ زندگی کے ہاتھوں بیزار ہے۔ وہ نگاہ فریب مناظر میں جذب ہو کر اپنی ذات کی گہرائیوں سے یکسر منقطع ہو چکا ہے۔ اس کی منظم مادہ پرستی کے میدان میں اس کی توانائی پر وہ فالج گر چکا ہے جسے ہکسلے کی نگاہ نے بھانپا اور اس پر اظہارِ تاسف کیا تھا۔

(خطبات۔ صـ۱۸۷)

انہوں نے عصرِ حاضر کے انسان کی اس کیفیت کو بالِ جبریل میں دو مصرعوں میں اس طرح سمٹا کر بیان کیا

ہے کہ ۔

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی　　کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

میں چاہتا تو اس موضوع پر بیسیوں شہادات کا اضافہ کر سکتا تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک تو اس لئے کہ قلتِ وقت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اور دوسرے اس لئے کہ یہ اخلاقی پستیاں، یہ تباہیاں اور بربادیاں، ہمارے لئے اب جگ بیتی نہیں رہیں، آپ بیتی بن چکی ہیں۔ یہ سب ہمارے دن کی روزمرہ کی زندگی کا معمول بن چکی ہیں جن کے ہاتھوں ہم میں سے ہر شخص نالاں ہے لیکن ان کا کوئی مداوا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لہٰذا مجھے، مزید شہادات پیش کئے بغیر آگے بڑھ جانا چاہیئے یہ دیکھنے کے لئے کہ ان مفکرین کے نزدیک، ان تباہیوں کا بنیادی سبب کیا ہے، یہ بڑے غور سے سننے اور سمجھنے کے قابل ہے۔

میسی مقصدِ متلبین نے اپنی ایک کتاب (فلاسفی اوف ریلیجن) میں ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق تاریخ سے کی جا سکتی ہے کہ جب کبھی سائنٹیفک زاویۂ نگاہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایسے مفکر پیدا ہو جاتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بنیادی اور ابدی صداقتوں میں بھی اسی زاویۂ نگاہ کے مطابق تبدیلی پیدا کر دی جائے ۔۔۔ جب اٹھارویں صدی میں نیوٹن کے نظریہ کے ماتحت خارجی کائنات کے متعلق ایک نیا تصور قائم ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس کا بھی تقاضا شروع ہو گیا کہ اب دنیا کو مذہب بھی نیا ملنا چاہیئے چنانچہ اس کے مطابق ایک نیا مذہب بھی پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے تقاضا کیا کہ اخلاقیات، ادب اور مابعد الطبیعیات کو اپنے بنیادی اصول اور جوہر بدل لینے چاہئیں تاکہ وہ اس سائنٹیفک زاویۂ نگاہ کے مطابق ہو جائیں۔
> (P. 7)

شبلی نے تو نیوٹن کی مثال دی ہے۔ خود ہمارے زمانے میں جب آئن سٹائن نے نظریۂ اضافیت (RELATIVITY) پیش کیا تو ویسٹر مارک نے کہا تھا کہ اخلاقیات کو بھی اضافی .... (RELATIVE) ہونا چاہیئے، نہ کہ مطلق (ABSOLUTE) بالفاظِ دیگر بات یہ کہی گئی کہ، خارجی کائنات کے متعلق سائنس کے انکشافات جو تصور پیش کریں، اخلاقی اقدار کو بھی انہی کے مطابق ڈھلتے اور بدلتے رہنا چاہیئے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں مادہ (MATTER) کے متعلق بڑے وسیع پیمانے پر سائنسی تحقیقات ہوئیں۔ انہی میں نظریۂ ارتقا (THEORY OF EVOLUTION) بھی تھا۔ یہ نظریہ اس حد تک تو صحیح تھا کہ زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، اولین جرثومہ سے درجۂ حیوانات تک پہنچی ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ بھی کہا گیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح صرف طبیعی جسم سے عبارت ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اس کا دماغ، دیگر حیوانات کے مقابلہ میں ذرا بڑا ہے، اس لئے اس میں عقل و شعور کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہے۔ اس سے زیادہ انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں۔ اس

کی زندگی بھی طبیعی قوانین کے تابع ہے ——— یہ بھی عام حیوانات کی طرح، کھاتا پیتا۔ افزائش نسل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد موت اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس باطل نظریہ کا اثر، انسانی زندگی پر کیا پڑا، یہ چیز قابلِ غور ہے اور موجودہ عالمگیر انسانی تباہیوں کا بنیادی سبب۔

اس کا سبب

حیوانات کا مقصد اپنے آپ کو زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے انہیں طبیعی سامانِ زیست (کھانے پینے کی چیزوں) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ضروریات کے پورا کرنے کے لئے ان ...... کے سامنے جائز، اور ناجائز کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ (مثلاً) ایک بھوکا بیل باہر جاتا ہے تو جو کھیت سب سے پہلے اس کے سامنے آئے وہ اسی میں سے چرنے لگ جاتا ہے، بلاتمیز اس کے کہ وہ کھیت اس کے مالک کا ہے یا کسی اور کا ——— اپنے کھیت اور دوسرے کے کھیت کی یہ تمیز، انسانی سطح کا خاصا ہے، حیوانی زندگی میں یہ امتیاز ہوتا ہی نہیں۔ اسی تمیز و تخصیص کو "جائز اور ناجائز" میں فرق کیا جاتا ہے اور اسے اصطلاح میں قدر یا (VALUE) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اقدار کا تصور انسانی سطح کا خاصا ہے۔ حیوانات میں یہ چیز مفقود ہوتی ہے۔ وہ، اقدار کے تصور سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یورپ کی سائنسی تحقیقات نے یہ تصور پیدا کیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے۔ اس نظریہ کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کے سامنے اقدار کا تصور نہ رہا۔ اس نے بھی زندگی کا مقصد، اپنی طبیعی ضروریات کا پورا کرنا سمجھ لیا، اور بس۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

درنگاہش آدمی، آب و گِل است ‏ ‏ ‏ ‏ کاروانِ زندگی بے منزل است

قرآن کریم نے اس نظریہ کو کفر کہہ کر پکارا ہے، اور اس کا نتیجہ جہنم۔ سورۂ محمدؐ میں ہے:۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۔ (47/12)

جن لوگوں کا تصورِ زندگی حیوانات کی طرح کھانا پینا اور دیگر سامانِ زیست سے متمتع ہونا ہے، اور بس۔ وہ کفر کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس زندگی کا نتیجہ جہنم ہے۔

اس آیت سے دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اقدار کا تصور، کفر اور اسلام میں مابہ الامتیاز ہے۔ جس زندگی کا مقصد محض طبیعی ضروریات کا پورا کرنا ہے، وہ کفر کی زندگی ہے۔ اسلام کی زندگی وہ ہے جس میں اقدار کی پابندی مسلکِ حیات ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ اقدار کو نظر انداز کر دینے سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ عذابِ جہنم میں مبتلا ہوگا ——— اس دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی ——— اس دنیا کا جہنم آج ہم سب کے سامنے ہے۔

اقوامِ مغرب نے اپنے نظامِ سیاست کی بنیاد جس (جدید) نظریۂ حیات پر رکھی۔ اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں مطلق اور غیر متبدل اقدار کا تصور نہیں ہوتا۔ اپنی تمدنی زندگی کے لئے معاشرہ

سیکولرازم

جس قسم کے قوانین چاہے مرتب کرلے۔ لیکن مارکس اس سے ایک قدم آگے بڑھا۔ اس نے اس حیوانی نظریہ پر اپنے معاشی نظام کی بنیاد رکھی جسے کمیونزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ اخلاق و اقدار کے تمام تصوّرات، عہدِ بارینہ کی فرسودہ کہانیاں ہیں جو جہالت اور توہم پرستی کی پیدا کردہ ہیں۔ انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے ـــــ فیورباخ کے الفاظ میں:-

(MAN IS WHAT HE EATS)

یعنی "انسان عبارت ہے اس سے جو کچھ وہ کھاتا ہے"۔ (ESSENCE OF CHRISTIANITY)

خود مارکس نے اپنی کتاب (کیپٹل جلد اوّل) میں لکھا کہ:-

اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات، اور اسی قسم کے دیگر نظریات کا آزادانہ وجود کوئی نہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ ان کا کوئی نشو و ارتقاء نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنی مادی پیداوار اور مادی روابط کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ، اپنے خیالات، اور ان خیالات سے پیدا شدہ تصوّرات کو بدلتا رہتا ہے۔ (انہی کا نام عقائد و اخلاقیات اور اقدار ہیں)۔

مارکس کے رفیقِ اوّل، اینگلز نے کہا کہ

(ہمارے فلسفہ حیات کی رو سے) دنیا میں کوئی شے حرفِ آخر، مطلق یا مقدس نہیں۔ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے اور پیچھے سے آئی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

اور لینن نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ

ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصوّر کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے، دھوکا ہے۔ یہ تصوّر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر، محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھندھ میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے......

سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق، احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مانتے ہی نہیں...... ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔[1]

مختصر الفاظ میں، کمیونزم نے یہ تصوّر عام کیا کہ انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے اور اس مسئلہ کا حل، تمدّن و سیاست کا بنیادی اور منفرد فریضہ ہے، خواہ وہ کسی طریق سے ہو۔ کمیونسٹ ممالک میں تو اس تصوّر

---

[1] ان اقتباسات کے حوالوں کے لئے، میری کتاب "نظامِ ربوبیت"، ملاحظہ فرمایئے۔

کا عام ہونا فطری امر تھا، لیکن کمیونزم کے پراپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جو ممالک کمیونزم کے مخالف ہیں، ان میں بھی یہ تصور عام ہو گیا ہے۔ یعنی اس وقت دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں انسانی زندگی کا سارا مسئلہ "روٹی، کپڑا اور مکان" نہ قرار پا گیا ہو۔ اس میں کمیونسٹ ممالک اور غیر کمیونسٹ ممالک۔ مسلم مملکتیں اور غیر مسلم مملکتیں۔ مغربی اقوام اور مشرقی اقوام، سب شامل ہیں ——— روٹی۔ روٹی۔ روٹی، ہر ایک کی زبان پر ہے۔ اقدار کا لفظ تک کہیں سنائی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مارکس بڑا کامیاب ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کا پیش کردہ نظریۂ حیات تسلیم اور اختیار کر لیا جائے۔ سو ایسا ساری دنیا میں ہو گیا ہے۔ سعدی نے کہا تھا کہ

چناں قحط سالے شد اندر دمشق　　　کہ یاراں فراموش کردند عشق

اُس قحط سالی میں تو معلوم نہیں کہ عشاق نے عشق فراموش کر دیا تھا یا نہیں۔ لیکن ہمارے زمانے نے تو اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ روٹی کے مسئلہ نے اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ عالمگیر نوعِ انسان یکسر اقدار فراموش ہو گئی ہے۔ آج نہ کسی کا روٹی سے بلند کوئی مطالبہ رہ گیا ہے، نہ دعویٰ کرنے والے روٹی مہیا کرنے کے سوا کوئی وعدہ کرتے ہیں۔ سوچئے کہ یہ رشتہ، کمہار اور اس کے گدھے کے رشتے سے ذرا بھی مختلف اور بلند ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ روٹی کا مسئلہ اپنی جگہ بڑا اہم ہے کیونکہ انسان کی طبیعی زندگی کا مدار اس پر ہے۔ لیکن یہ مقصود بالذّات نہیں ——— ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ بلند مقصد ہے غیر متبدل اقدار کا تحفظ۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :-

نگہ خود را بہ چشمِ مہرِ ماہ　　　نگاہِ ماست مارا تازیانہ
تلاشِ رزق ازاں داد ند مارا　　　کہ باشد پَر کشودن را بہانہ　　(ارمغانِ حجاز)

اسی کا مفہوم اس نے اُردو شعر میں اس طرح بیان کیا تھا کہ

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اگر روٹی کا مسئلہ مقصود بالذات بن جائے تو یہ (قرآن کی رو سے) کافرانہ تصورِ حیات ہو گا جس کا نتیجہ جہنّم ——— اس سے انسان، حیوانی سطحِ زندگی پر آ جائے گا جس میں "جنگل کا قانون" مسلکِ حیات قرار پا جائے گا۔ یہی وہ مسلکِ حیات ہے جس سے آج ساری دنیا کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ :-

اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرد　　　دانہ ایں می کارد آں حاصل برد!
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است　　　از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است
پردۂ آدم دری، سوداگری است!　　(پس چہ باید کرد)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ موجودہ عالمگیر تباہی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انسان، حیوانی سطحِ زندگی اختیار کر چکا ہے جس کی وجہ سے بلند انسانی اقدار کا تصور گم ہو گیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس خود اقوامِ مغرب کے مفکرین کو بھی ہو رہا ہے۔ لارڈ سنل (جس کی کتاب کا اقتباس شروع میں پیش کیا جا چکا ہے) موجودہ دور کی تباہ کاریوں کا تفصیل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ

ریب و تشکیک اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس، انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

اخلاقی اقتدار کا ابدی اور غیر متبدل ہونا ضروری ہے۔ اس قسم کی اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اور وحی اپنی منزہ شکل میں آج، اس آسمان کے نیچے، قرآنِ مجید کے سوا کہیں نہیں لہٰذا، تباہیوں کے موجودہ جہنم سے نکلنے کے لئے سب سے پہلی شرط، ان اقدار کی صداقت پر یقینِ محکم ہے۔ اسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان کی اہمیت کس قدر ہے، اس کے لئے مغربی مفکر الفریڈ کوبن کی یہ شہادت سامنے لائیے کہ

جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انسان، ایمان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اسے دورِ حاضر کے نوجوانوں کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو اس تلاش میں مضطربانہ پھر رہے ہیں کہ کوئی ایسی شئے مل جائے جس پر ایمان لایا جائے۔[1]

ایمان کے لئے انسان کی اس مضطربانہ تلاش کی کیفیت کیا ہے، اس کے لئے مغرب کے مشہور فلاسفر پیسکال کے یہ الفاظ گہری توجہ کے محتاج ہیں۔ اس نے لکھا ہے:۔

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ جب اسے ایمان، اور محبت کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بیکار اور خراب مقاصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا، قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دست کش ہو جائے تو برے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔ .... وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ موت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ اقدار، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ مسلم اقوام ہوں یا غیر مسلم، یہ اقدار کسی کے سامنے بھی نہیں۔ ان سب کے نزدیک، اصل مسئلہ صرف

---

[1] ان حوالوں کے لئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" دیکھئے۔

روٹی کا رہ گیا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلم اقوام میں سے ہر قوم ہی نہیں، ہر فرد اس کا مدعی ہے کہ قرآن پر اس کا ایمان ہے۔ تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مسلم اقوام نے بھی ان اقدار کو چھوڑ کر حیوانی (کافرانہ) زندگی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ یہ تو کھلا ہوا تضاد ہے! لیکن اس میں کوئی تضاد نہیں ——— اصل یہ ہے

ایمان کسے کہتے ہیں؟

کہ جسے عام طور پر "ایمان" کہتے ہیں، درحقیقت وہ ایمان نہیں۔ لفظِ ایمان کا زبان سے ادا کر دینا ہے۔ قرآن کے الفاظ کو زبان سے دہراتے رہنے کا نام ایمان رکھ لینا فریبِ نفس ہے۔ اور ہم سب اسی فریبِ نفس میں مبتلا ہیں ——

آج کے رانجھے، آج کے مجنوں، سب لفظوں سے کھیلنے والے
بھول گئے محمل والے کو، وردِ زباں ہے، محمل محمل!

اس فریبِ نفس کے لئے ہم نے اپنی زبان میں ایک لفظ وضع کر رکھا ہے جو ہماری نگاہ کو حقیقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ جس سے پوچھئے وہ کہہ دے گا کہ میں "خدا کو مانتا ہوں۔ خدا کی کتاب کو مانتا ہوں"۔ ہم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ اس "مانتا ہوں" کا مفہوم کیا ہے؟ غور کرنے پر نظر آجائے گا کہ یہ صرف دو لفظ ہیں جنہیں دہرا دیا جاتا ہے۔ درحقیقت ان سے مقصود و مطلوب کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ پر ایمان کے معنی ہیں اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔ اور اس کی کتاب پر ایمان کا مطلب ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ جس ایمان کی شہادت انسان کا عمل نہیں دیتا، اس ایمان کا کچھ فائدہ نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں:-

لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَکُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ کَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِهَا خَیْرًا۔ (۶/۱۵۹)

جس شخص کے ایمان کے ساتھ عملِ خیر شامل نہیں ہوگا، اس کا ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ (اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ کی بحث کا یہ موقع نہیں)۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ——— مردہ آں ایمان کہ ناید در عمل ——— سمجھنے کی خاطر یوں کہئے کہ ایمان، کیمسٹری کا ایک فارمولا ہے جس کے مطابق لیبارٹری میں عمل کر کے وہ نتیجہ پیدا کیا جائے گا جس کے لئے وہ فارمولا وضع اور مرتب ہوا تھا۔ اگر آپ اس فارمولا کو سنہری حروف میں لکھ کر حریر و اطلس کے جزدانوں میں لپیٹ رکھیں، یا صبح شام اس کے الفاظ کو دہراتے رہیں، تو کیا اس سے وہ نتیجہ مرتب ہو جائے گا؟ قیامت تک نہیں ہوگا۔ دعوئ ایمان بلا عمل کی یہی مثال سمجھئے۔ موجودہ مسلم اقوام کے دعوائے ایمان کی حالت کیا ہے، اس کے لئے مثالیں تو بہت سی دی جا سکتی ہیں لیکن میں یہاں صرف اس ایک مثال پر اکتفا کروں گا جو اس وقت

قتلِ مومن

ہم سب کے سامنے ہے اور جس نے ہمارے سینوں کو چھلنی کر رکھا ہے۔ سورۃ النساء کی یہ آیت کس مسلمان کے سامنے نہیں۔ جس میں کہا گیا

ہے کہ

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (۴/۹۳)

جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنّم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اس کی لعنت۔ خدا نے اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ایک مسلمان کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کے انفرادی قتل کو تو چھوڑ دیجئے۔ جس طرح مسلمان قومیں، ایک دوسرے کے قتل میں مصروف ہیں۔ (اور ظاہر ہے کہ جنگ میں قتل بالارادہ ہی ہوتا ہے) وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان، باہمی قتال میں مصروف مسلمان قوموں کا قرآنِ مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟ میں کہتا ہوں کہ (سارے قرآن کو چھوڑ دیجئے) اگر مسلمان اقوام کا قرآنِ مجید کی اس ایک آیت پر ہی ایمان ہوتا، تو ہماری تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا!

یہ تو رہا ان مسلمان قوموں کے متعلق جو جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہیں وہ مسلمان قومیں جو خود تو شریکِ جنگ نہیں، لیکن ان لڑنے والوں کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ وہ بھی یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب نہیں دے سکتیں کہ ہمارا قرآن پر ایمان ہے۔ ہم قتال کے جرم کی مرتکب نہیں۔ ان کے متعلق بھی قرآنِ کریم میں یہ ارشاد موجود ہے کہ

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (۴۹/۹)

اگر مسلمانوں کے کوئی دو گروہ باہمدگر نبرد آزما ہو جائیں تو تمہارا فریضہ ہے کہ تم آگے بڑھ کر ان میں صلح کرا دو۔

جو مسلمان قومیں، مسلمانوں کے ہاتھوں دوسرے مسلمانوں کے قتل کو خاموش بیٹھے دیکھ رہی ہیں، انہیں سوچنا چاہیئے کہ کیا اُن کا قرآنِ مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟

عزیزانِ من! میں نے یہ مثالیں، صرف یہ بتانے کے لئے پیش کی ہیں کہ یہ کہہ دینا کہ ہمارا قرآنِ کریم پر ایمان ہے اور عملاً اس کے خلاف جانا، قرآن پر ایمان نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا آج، اقتدارِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال کر محض روٹی کے مسئلہ کو مقصدِ حیات قرار دینے والی مسلمان مملکتیں بھی اسی طوفان میں بہے جا رہی ہیں جن میں دنیا کی غیر مسلم اقوام دستِ تلاطم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اور ہم سب اس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں جسے قرآنِ کریم نے اس منہجِ زندگی کا فطری نتیجہ قرار دیا تھا۔ جب تک ہم اقتدارِ خداوندی کی اہمیت کو سرِ فہرست نہیں رکھتے، معاشرہ کی جن تباہ کن خرابیوں کا ہم رونا روتے رہتے ہیں، ان میں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیجئے ؎

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

غیر مسلم قومیں تو پھر بھی کہہ سکتی ہیں کہ ہمارے پاس وہ غیر متبدل اقدار نہیں۔ سوچیئے کہ مسلمان قومیں اس باب میں کیا کہہ سکتی ہیں؟

(۰)

استبدالِ قومی

اب میں، ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ قرآن کریم نے اُس قوم سے، جو اقدارِ خداوندی سے اعراض برتنے، یہ کہا تھا کہ

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)

اگر تم ان اقدار سے اسی طرح اعراض برتتے رہے، تو تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

یعنی ایسی قومیں جو ناقابلِ اصلاح حد تک پہنچ چکی ہوں، ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی قوم جو ان سے بہتر ہوتی ہے، انہیں مصافِ زندگی سے الگ کر کے، ان کی جگہ لے لیتی ہے۔ ظاہر ہے استبدالِ قومی کا یہ پروگرام اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب دنیا میں ایسی قومیں موجود ہوں جو اقدار کی میزان میں دوسری قوموں سے بہتر ہوں۔ لیکن موجودہ دور میں تو دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ اب تو دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں جس کے ان اقدارِ خداوندی کا تصور غالب ہو اور وہ اس معیار کے مطابق دوسری اقوام سے بہتر ہوں۔ اس وقت تو کیفیت یہ ہے کہ ؎

خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار　　سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

بلکہ اس سے بھی آگے ——— یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری ——— میں جب اس حقیقت پر غور کرتا ہوں تو بڑی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ ان حالات میں، جبکہ استبدالِ قومی کا یہ پروگرام ناقابلِ عمل نظر آتا ہے، مشیتِ خداوندی نہ جانے نوعِ انسان کی نجات کے لئے اور کونسا طریق اختیار کرے؟ قرآن کریم میں ایک مقام پر یہ بھی آیا ہے: يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۔ "اے نوعِ انسان کان کھول کر سُن لو کہ خدا تمہارا محتاج نہیں۔ تم اُس کے محتاج ہو۔ وہ قابلِ حمد و ستائش ذات، (تمام کائنات سے) مستغنی ہے۔" اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ۔ "وہ اپنے قانونِ مشیت کی رُو سے ایسا بھی کر سکتا ہے کہ تم سب کو لے جائے۔ (چلتا کرے) اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے۔" وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔ (۳۵/۱۵-۱۷) "خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔" اس میں شبہ نہیں کہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ موجودہ نسلِ انسانی کو معدوم کر کے، کرۂ ارض پر کوئی نئی مخلوق بسا دے۔ اس کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ لیکن قرائن، اور قرآن کریم کے دیگر مقامات سے مترشح ہے کہ اس سے موجودہ انسانوں کی جگہ کوئی دوسری مخلوق لے آنا مقصود نہیں بلکہ اسی نوعِ انسانی سے ایسے افراد، گروہ یا قوم پیدا کر دینا ہے جو سیرت و کردار کی رُو سے موجودہ اقوام سے

مختلف ہوں ——— اوّل تو اس لئے کہ نسلِ آدم ابھی اپنی بھرپور جوانیوں تک پہنچی ہی نہیں۔ انسان بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے جن میں سے ہنوز عشرِ عشیر کی بھی نمود نہیں ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے اس نکتہ کی تشریح مختلف انداز و اسلوب سے کی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا — وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

دوسرے مقام پر ہے:

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز — گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

انسان کا مستقبل

اور پھر ان کے وہ چار مصرعے جن میں انہوں نے اپنے مخصوص، شوخ، دلآویز انداز میں حقائق کی ایک دنیا سمٹا کر رکھ دی ہے، انسان کے مستقبل کا بڑا حسین آئینہ ہے۔ کہتے ہیں:

یکے در معنیِ آدم نگر، از من چہ می پرسی! — ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے — کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

انسان کی ذات کے ارتقاء کی وسعتیں اور رفعتیں تو ایک طرف، مادی زندگی میں بھی اس کی قوتوں کی نمود کا ابھی ابھی آغاز ہوا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)

اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اُسے خدا نے تمہارے لئے تابعِ تسخیر کر دیا ہے یعنی انسان میں تسخیرِ کائنات کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ ابھی تو ان صلاحیتوں کی نمود کا آغاز ہی ہوا ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل میں نہ معلوم کتنے قرن درکار ہوں گے۔ باقی رہا اس کی ذات کا ارتقاء۔ سو اس کی وسعتوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

عرشِ معلّیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں — گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا — اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود! (اقبالؒ)

لہٰذا، نوعِ انسان نے کرۂ ارض پر ابھی بے شمار منازل طے کرنی ہیں۔ ابھی تو قرآنی نظام کے متعلق وہ دور آنا ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳) "وہ نظام، انسانوں کے تمام خود ساختہ نظاموں پر غالب آ جائے گا" ——— یہ اس زمانے میں ہوگا۔ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۳/۶) "جب عالمگیر انسانیت خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے اُٹھ کھڑی ہوگی" ——— وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی"۔ یہ يَوْمُ الدِّيْنِ ہوگا۔ یعنی قرآنی نظام کا دور جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ: يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا۔ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا دستِ نگر، محکوم، محتاج یا "ذلیل" نہیں ہوگا۔ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹) کیونکہ اُس وقت جملہ امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رو سے ہوں گے"۔ یہ دور اسی کرۂ ارض پر، نوعِ انسان کے ہاتھوں رونما ہوگا۔ لہٰذا، خدا کے پروگرام مشیت

کے مطابق ایسا نہیں ہوگا کہ انسان اس سے پہلے ہی معدوم ہوجائے۔ جب تک قرآن موجود ہے، انسان معدوم نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن نوعِ انسان ہی کی راہ نمائی کے لئے ہے۔ کیا خوبصورت انداز ہے کہنے والے کا جس نے کہا ہے کہ

از صد سخنِ پیرم، یک حرف مرا یاد است — عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

لہٰذا، (ہمارے علم کی موجودہ سطح کے مطابق) "یَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ" میں خلقِ جدید سے مراد انسانوں سے الگ کوئی اور مخلوق نہیں۔ اسی انسان کا، اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور نمود، اور اقدارِ خداوندی کے مطابق اپنی داخلی دنیا میں تغیر کی رو سے ایک "نیا انسان" بن جانا مقصود ہے۔ لفظ خلق کے معنی "کثرتِ استعمال کے بعد کسی چیز کا صاف اور ہموار ہو جانا۔ اس میں صحیح صحیح تناسب اور اعتدال پیدا ہو جانا۔ اس کی مناسب تربیت ہو جانا" بھی ہیں۔ اسی کو عادات و اطوار یا خلق کہا جاتا ہے۔ اسی اعتبار سے حضور نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا کہ: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴) "اے رسول! یہ حقیقت ہے کہ تو خلقِ انسانی کے عظیم ترین مقام پر فائز ہے"۔ حضورؐ کی یہی زندگی ہے جسے نوعِ انسان کے لئے اُسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ (۳۳/۲۱) اسی اسوۂ حسنہ کے اتباع سے، اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ (انسانیت کی پست ترین سطح پر پہنچا ہوا آج کا انسان) "احسنِ تقویم" کا درخشندہ پیکر بن جائے گا۔ (۹۵/۴-۵) انہی افراد پر مشتمل وہ قوم ہوگی جو بگڑی ہوئی اقوامِ عالم کی جگہ لے گی۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے قوموں کی بعثت کے لئے بھی خلق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَمِمَّنْ خَلَقْنَا اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۔ (۷/۱۸۱) "وہ لوگ جنہیں ہم نے ایسی قوم بنایا ہے، جو لوگوں کی راہ نمائی، الحق (وحیِ خداوندی) کے مطابق کرتی ہے اور اسی کی رو سے ان کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کرتی ہے"۔ یہی انسان کی وہ خلقِ جدید ہے جسے اقبالؒ آدمِ نو کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:

نقشِ دگر طراز دہ، آدمِ پختہ تر بیار — لعبتِ خاک ساختن می نسزد خدائے را

بلکہ اس سے بھی شوخ تر الفاظ میں کہ:

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل — کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

انہیں اسی آدمِ نو کے کچھ کچھ آثار ——— مفکرینِ مغرب کے افکار و تخیلات میں دکھائی دیتے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے، پیامِ مشرق کے دیباچہ میں ان الفاظ میں کیا تھا:۔

> یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے۔

آئن سٹائن کے مقابلہ میں، برگساں نے اس موضوع پر زیادہ وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ اپنی آخری تصنیف

(The two sources of Morality and Religion) میں لکھتا ہے:-

آج نوعِ انسان، خود اپنی ترقی کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی کچلی ہوئی مصروفِ آہ و فغاں ہے یہ اس لئے کہ انسان کو اس کا احساس نہیں کہ اس کا مستقبل خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اس کے لئے سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں؟ پھر اس کے بعد یہ کہ انسان محض زندہ ہی رہنا چاہتا ہے یا اس سے آگے بڑھ کر فریضۂ کائنات کی تکمیل کے لئے بھی جدّوجہد کرنے کو تیار ہے۔ فریضۂ کائنات کیا ہے؟ خدائی صفات کے حامل افراد کی تخلیق۔ (ص ۳۰۶)

آپ اِس اقتباس کے آخری الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے۔ یعنی "فریضۂ کائنات کیا ہے؟ خدائی صفات کے حامل افراد کی تخلیق"۔ کیا یہ قرآن کریم کی اس آیت کا گویا ترجمہ نہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔ (۲/۱۳۸)

خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان کہ جس رنگ سے زیادہ حسین کوئی رنگ نہیں۔

جیسا کہ میں نے متعدد بار کہا ہے، انسان کے ہر تجربہ کی ناکامی، اُس کی فکر کا رُخ اُس سمت کی طرف موڑ دیتی ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے۔ قومیں خواہ کتنی ہی بگڑ چکی ہوں، ان میں ایسے افراد ضرور ہوتے ہیں جو زندگی کے حقائق اور صداقت کے متلاشی ہوں۔ اور یہ حقائق اور صداقت قرآنِ مجید کے سوا کہیں موجود نہیں۔ لہٰذا کوئی زمانہ بھی اس قسم کے افراد سے خالی نہیں ہوتا۔ قرآن زندہ حقائق کا ضابطہ ہے۔ اگر ان حقائق کی جستجو اور تڑپ کہیں نہ رہے تو دنیا میں قرآن کی موجودگی بے معنی ہو جائے۔ ایسا ہو نہیں سکتا ؎

دل ہوں گے، مگر تیری تمنّا نہ رہے گی		یہ وقت جب آئیگا، تو دنیا نہ رہے گی

آج ذرائع مواصلات کے عام ہو جانے کی وجہ سے، اس قسم کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فکری رابطہ بھی پیدا کر رہے ہیں جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک دن ایک گروپ کی شکل اختیار کر لیں گے۔ یہ ہوگا وہ گروپ جو باقی انسانوں پر تیزی کے ساتھ اثر انداز ہوگا۔ روسی مفکر اوسپنسکی کے استاد (یا گرو) گرجیف نے کہا تھا:-

انسانیت کا ارتقاء ایک مخصوص گروپ کی وساطت سے ہی عمل میں آ سکتا ہے۔ یہ گروپ باقی نوعِ انسانی پر اثر انداز ہوگا اور اس کی راہ نمائی کرے گا۔

(All and Every Thing,- Page 309)

بات یہاں سے چلی تھی کہ اس وقت دنیا میں کوئی قوم بھی ایسی نہیں جو قرآن کے معیار کے مطابق، باقی اقوام سے بہتر ہو۔ اس لئے استبدالِ قوی کا طریق تو ان حالات میں ممکن العمل نہیں۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ اس کے لئے دوسرا طریق یہ ہے کہ انہی اقوام میں سے، انسانی سطح پر زندگی

بسر کرنے کے متمنی افراد ربطِ باہمی سے ایک ہم آہنگ گروپ کی شکل اختیار کر لیں۔ یہی وہ طریق تھا جس کے مطابق، صدرِ اوّل میں اصلاحِ انسانیت کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ ظہورِ نبوی ؐ کے وقت بھی دنیا میں کوئی ایسی قوم موجود نہیں تھی جو قرآنی معیار کے مطابق اپنی ہمعصر اقوام سے بہتر ہو۔ لیکن ایسے افراد موجود تھے جن میں تلاشِ حقیقت کی تڑپ تھی لیکن صحیح راستہ ان کے سامنے نہیں تھا، انہیں صحیح راستہ دکھا یا گیا تو وہ بکھرے ہوئے افراد، نسل، رنگ، زبان اور وطن کی حدود و قیود سے بلند ہو کر، ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ اس طرح وہ اُمت وجود میں آگئی جسے اُمتِ وسطیٰ یا خیر اُمتہ کہہ کر پکارا گیا۔ اس نے باقی انسانوں کی زندگی کو متاثر کیا اور اس طرح ان کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کی۔ یہ اُس دَور کے "آدمِ نو" تھے۔ باقی نسلِ انسانی سے یکسر مختلف، اگرچہ طبیعی اعتبار سے ..... بَشَرٌ مِّثْلُهُمْ ..... مجھے کچھ ایسا نظر آرہا ہے کہ موجودہ حالات میں، ایک نئی قوم پیدا کرنے کا وہی طریق پھر کارفرما ہوگا، اس فرق کے ساتھ کہ اس زمانے میں وہ مرکز، رسول اللہ کی ذاتِ گرامی تھی لیکن اب اس مرکزیت کے لئے کوئی رسولؐ یا مامور من اللہ نہیں ہوگا۔ ختمِ نبوت نے ماموریت من اللہ کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اب یہ افراد، باہمی مشاورت سے اپنی مرکزیت آپ قائم کریں گے۔ انسانی شعور اب اتنا بالغ ہو چکا ہے کہ اگر اسے صحیح راستہ مل گیا تو پھر وہ غلط موڑ نہیں مڑے گا۔ لہٰذا، اب کائنات کا یہ بگڑا ہوا نقشہ، قرآنی راہ نمائی کی روشنی میں عام انسانوں ہی کے ہاتھوں صحیح خطوط پر مرتب ہوگا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پولینڈ کے فلاسفر (BERDYAEV) نے اس حقیقت کو اپنے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

> یہ دنیا ممکنات کی دنیا ہے۔ یہ مکمل شدہ جامد و ساکت نہیں۔ اس میں عملِ تخلیق جاری رہے گا۔ اور جو انسانوں کے ہاتھوں جاری رہے گا۔ اب انسان کو اپنی ممکنات سے خود پردہ کشائی کرنی ہوگی اور ہر مضمر کو مشہود کر کے دکھانا ہوگا۔ یہ عملِ تخلیق، خدا کی طرف سے انسانوں کی طرف ہی نہیں آتا بلکہ خدا خود انسانوں سے تخلیقی جذبوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کا منتظر رہتا ہے۔[1]
>
> (THE DEVINE & THE HUMAN; -P.53)

ختمِ نبوت سے یہی مقصود تھا، یعنی، قرآنِ کریم کے الفاظ میں، ان زنجیروں کو توڑ کر جن میں انسان جکڑا ہوا چلا آرہا تھا، اور ان کے سر پر سے ان سلوں کو اتار کر جن کے بوجھ تلے وہ کچلا جارہا تھا، اُسے وہ آزادی عطا کر دینا جس سے وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری طرح نشو و نما کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہی وہ آزادی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

---

[1] خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست (اقبالؒ)

قرآن کے الفاظ ہیں: وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ (۷/۱۷۶) ہم تو چاہتے تھے کہ اسے، قرآن کے ذریعے آسمان کی بلندیوں کی طرف لے جائیں، لیکن یہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ کر، زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس نَشْاَةً ثَانِيَةً: اس خلقِ جدید سے انسان، اپنی حیوانی زندگی کی خاک پیوندی سے دامن چھڑا کر شرفِ انسانی کی رفعتوں کی طرف گامزن ہو جائے گا۔ قرآن کے باقی اور محفوظ رکھنے سے یہی مقصود تھا۔

ابلیس کا چیلنج

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس قسم کے افراد ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ ابلیس نے جب خدا کو چیلنج دیا تھا کہ تو نے آدم کو مجھ پر فضیلت تو دے دی ہے لیکن تو دیکھ کہ میں اولادِ آدم کو کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا تھا کہ جو تیرے جی میں آئے کر دیکھ: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۷/۶۵) میرے بندوں پر تیرا غلبہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اس "دام و دد" سے معمور کرۂ ارض کے جنگل میں یہ "عبادی" ہی وہ سعادت بخت انسان ہیں جنہیں ہم نے "آدمِ نو" سے تعبیر کیا ہے۔ رومی نے اسی قسم کے انسانوں کی تلاش کی جدوجہد کو اس قدر بلیغ اور دلآویز پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اقبالؒ نے ان اشعار کو، اپنی پہلی تصنیف، اسرارِ خودی کے سرنامے کے طور پر درج کیا ہے۔ رومیؒ نے کہا ہے کہ:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر ۔۔۔ کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت ۔۔۔ شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست!

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما!

گفت آنکہ یافت می نشود، آنم آرزوست

(کل میں نے "شیخ" کو دیکھا کہ وہ دیا ہاتھ میں لئے، دن کی روشنی میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟ کہا کہ میں ان حیوانوں اور جانوروں سے تنگ آ چکا ہوں، اور کسی انسان کو تلاش کر رہا ہوں۔ یہ میرے سہل انگار رفیق! ان سے میں بہت دل گرفتہ ہوں۔ اور تلاش کر رہا ہوں کسی شیرِ خدا اور رستمِ داستان کو!

میں نے کہا کہ میں نے بھی بہت تلاش کیا ہے لیکن ایسا انسان مجھے نہیں ملا — یہ جنسِ نایاب ہے۔

کہنے لگے کہ اسی نایاب جنس ہی کی تو مجھے تلاش ہے۔)

اسی جنسِ نایاب کی تلاش میں خود اقبالؒ بھی عمر بھر مصروفِ تگ و تاز و مشغولِ نے نوازی رہا ہے

غزل سرائیم و پیغامِ آشنا گویم ۔۔۔ بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم

تلاشِ صادق شرط ہے، ڈھونڈنے والے کو یہ افراد مل سکتے ہیں۔ عالمگیر فساد کے زمانے میں، ان افراد کے ربطِ باہمی، اور مناسب تعلیم و تربیت کے لئے، داستانِ بنی اسرائیل میں ہمیں ایک اشارہ ملتا

ہے۔ جب وہ فرعونی استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مصر میں غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے اور حضرت موسیٰ وہاں پیغامِ انقلاب لے کر پہنچے تو آپ سے کہا گیا کہ: وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً " (۱۰/۸۷) " ان سے کہو کہ تم بحالاتِ موجودہ اپنے گھروں ہی کو قبلہ بنا لو۔ اور وہاں اپنی تربیت شروع کر دو"۔ ابتداءِ کار کے لئے یہ چھوٹا سا گروہ، وہ ذرۂ اولین (FIRST CRYSTAL) بن جائے گا جس کے گرد اسی قسم کے دیگر افراد مرتکز ہوتے جائیں گے۔ ان میں نصب العین کی وحدت، وجہ ہم آہنگی ہوگی۔ اس قسم کے گروپ کے متعلق (BRIGHTMAN) لکھتا ہے کہ

> یہ ان آزاد لوگوں پر مشتمل ہوگا جو ایک معقول اور قابلِ قدر نصب العین کے حصول کے لئے باہمی تعاون و تناصر سے کام لیں۔ وہ نصب العین جس کی بنیادیں خدا کے ایمان پر استوار ہوں۔ (A PHILOSOPHY OF RELIGION)

قرآنِ کریم انہی افراد کے متعلق کہتا ہے:۔

> يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (۳/۱۹۹)
>
> اے وہ لوگو! جو وحدتِ نصب العین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو، اگر تم اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ تم میں سے ہر فرد، خود بھی ثابت قدم اور مستحکم رہے اور دوسروں کے لئے بھی اسی قسم کے ثبات و استحکام کا ذریعہ بنے۔ اور اس طرح تم سب ربطِ باہمی سے جادۂ ہدایتِ خداوندی پر گامزن رہتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ۔

میری تگ و تاز کا مقصد بھی عزیزانِ من! اسی قسم کے منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ وہ افراد جنہیں یہ یقینِ محکم ہو کہ انسانی مشکلات کا حل، قرآنِ مجید کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ اب میرا روئے سخن بالخصوص ان احباب کی طرف ہے جنہوں نے اس مقصد کو دل میں لئے میری دعوت کو درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔ اور وہ سوچتے ہیں کہ اس دعوت کے فروغ اور اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ کیا جائے۔ یہ جذبہ بڑا مبارک اور اس قسم کی کوششیں بڑی مستحسن ہیں۔ لیکن میں اس سلسلہ میں ایک وارننگ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ قرآنِ کریم، محض فکری وحدت کو کافی قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک حقیقی وحدت وہ ہے جو قلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہو۔ جو شخص محض ذہنی طور پر اس مقصد کو صحیح سمجھ کر اپنے آپ کو اس رشتہ میں منسلک کر لے گا وہ اس گروپ میں شامل تو ہو جائے گا لیکن صرف اتنے سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکے گی جسے قرآن اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ (۳/۱۰۲) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی دلوں کا آپس میں جڑ جانا ——— اور ایسا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کی فکر، آپ کے احساسات و جذبات کو متاثر اور متحرک نہ کرے۔ یاد رکھئے! تنہا فکر، عمل کی محرک نہیں ہو سکتی۔ عمل کے محرک جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ جب مختلف

وحدتِ قلبی

افراد کے جذبات ایک جیسی فکر سے متاثر ہوں گے کردار وعمل پیدا ہو گی اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ "وحدت افکار کی، بے وحدتِ کردار ہے خام" ——— اس قرآنی حقیقت کی اہمیت کو اب مغربی مفکرین بھی سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے ان کا سارا زور فکری ہم آہنگی پر ہوتا تھا۔ عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخِ تہذیب (J.H. DENISON) نے ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے:—— (EMOTION AS THE BASIS OF CIVILIZATION) اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ علامہ اقبالؒ جیسے عظیم مفکر نے اپنے چھٹے خطبہ کے شروع میں اس کتاب کا ایک طویل اقتباس دیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں (GEORGE FOOT MOORE) لکھتا ہے:۔

> تہذیب کی نشوونما اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کسی مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرے۔ اس قسم کا اتحاد، تنہا وحدتِ فکر کی بنا پر ممکن نہیں ہوتا۔ یہ اتحاد وحدتِ جذبات و احساسات سے ممکن ہوتا ہے جن سے انسانی فکر میں جذباتی تحرک پیدا ہوتا ہے اور وہ معتقدات اور مقاصد بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے مومنین کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ: بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (9/71)۔ وہ ایک دوسرے کے جگری دوست ہوتے ہیں، تو اس قسم کے تعلقات جذباتی وحدت کے بغیر ممکن نہیں۔ محض فکری وحدت سے آپ ہیں، گھڑی کے پرزوں کی طرح، میکانکی تعاون تو پیدا ہو جائے گا۔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ کی کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ گھڑی کے پرزے ساری عمر محوِ گردش رہتے ہیں، لیکن رہتے ہیں ویسے کے ویسے ہی۔ بلکہ وہ گھس کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ارتقاء..... نہیں ہوتا۔ فکری وحدت زیادہ سے زیادہ اسی قسم کے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ انسان کی داخلی دنیا میں تغیر پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اشتراک کے باوجود باہمی نزاعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ باہمی نزاع کی وجہ کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق مشہور روسی مفکر، اوسپنسکی لکھتا ہے کہ

> انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ مختلف جذبات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جائیں۔

(TERTIUM ORGANUM, - P.200)

جذباتی وحدت

وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہتا ہے کہ آپ دیکھئے۔ شراب پینے والے ایک دوسرے کے یار ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ شراب ان میں ایک جیسے جذبات پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح بھنگ پینے والے ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ کیونکہ برگِ حشیش ان سب کو ایک ہی قسم کے افلاک کی سیر کراتی ہے۔ لیکن شراب یا بھنگ کے نشے، ایک تو عارضی ہوتے ہیں، اور دوسرے ان میں، انسانی فکر معطل اور مسلوب ہو جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جب

ان کا نشہ اُتر جاتا ہے تو وہ پھر حسب سابق ایک دوسرے کے دشمن یا مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم جن جذبات کو وحدتِ فکر کی بنا پر ہم آہنگ کرتا ہے، ان میں یہ نقص نہیں ہوتا — نہ وہ عارضی ہوتے ہیں، اور نہ ہی ان میں فکر مسلوب یا معطل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ فکر کو اور جلا دیتے ہیں۔ جن خوش بخت افراد میں اس قسم کی فکری اور جذباتی وحدت پیدا ہو جاتی ہے، قرآن مجید، ان کی زندگی کو جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس جنتی معاشرہ میں داخل ہونے والوں کی اوّلین خصوصیت یہ ہوگی کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ (۷/۴۳) ان کے دلوں سے غلّ نکال دیا جائے گا۔ یہ لفظ (غلّ) ہے تو بہت چھوٹا سا لیکن معانی اور مفہوم کے اعتبار سے یہ بہت وسیع ہے۔ بات سمجھنے کے لئے یوں کہیئے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف گرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی۔ غلّ کے بنیادی معنی اسی قسم کی گرہ سمجھ لیجئے۔ اور اس گرہ سے ایک دوسرے کے خلاف، کینہ، کدورت، حسد، انتقام، عداوت کی جو زہر آلود خباثتیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو اس میں شامل کر لیجئے۔ یہ ہے مفہوم غلّ سے۔ جنتی معاشرہ کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غلّ نہیں ہوگا۔ اسے جنّت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دُور کر دیا جائے گا۔ یہ گرہیں کھول دی جائیں گی — اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

جنتی زندگی

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ (۱۵/۴۷)

اس کا عام ترجمہ تو یہی ...... ہے کہ "وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے" لیکن لفظ سُرُرٍ کا مادہ (س - ر - ر) ہے جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے (FACE TO FACE) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو۔ يُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا۔ (۲۵/۷۵) وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے۔ یہ وہ جنتی معاشرہ ہوگا جو قرآنی رفقاء پر مشتمل ہوگا۔ اس کے برعکس، جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: لَا مَرْحَبًا بِهِمْ۔ (۳۸/۵۹) وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں لیکن دل سے کبھی خوش آمدید نہیں کہتے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر کبھی خوش نہیں ہوتے اس لئے کہ ان کے دلوں میں غلّ مچلا ہوتا ہے۔

اس غلّ کے نکالنے میں عزیزانِ من! ایک اور بھی عمیق نکتہ مضمر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، غلّ کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ۔ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیڑ کر یا کھینچ کر نکالنا۔ جیسے پھانس نکال دی جائے۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں۔ ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض قرار دے کر ان کے بیسیوں علاج سوچے گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر

ثابت نہ ہوا۔ اب ماہرینِ علم النفس (PSYCHOLOGISTS) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہیں ہی نہیں۔ انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز گھر کر گیا ہوتا ہے جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں جا چھپا ہوا یہ راز، پھانس کی شکل اختیار کر لیتا ہے —— پھانس یوں تو کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو لمحہ بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتی۔ اب ان تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کا علاج تجزیہ نفس کی رو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح "کھینچ کر" باہر لے آتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ، اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریق علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی مریض ہیں بھی زیادہ وہیں۔ ایسا کس کس طریق سے کیا جاتا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدرِ مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے معالج پر کلی اعتماد ہونا چاہیئے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر، یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال لیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آیئے قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ (۷/۴۳) ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جنتی معاشرہ کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہوگی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جاگزیں سرِ مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہوگی ان کے شرحِ صدر کی۔

عزیزانِ من! اگر آپ کے باہمی تعلقات کی کیفیت ایسی ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ یہ تعلقات قرآنی رابطہ سے استوار ہیں۔ اگر ایسی کیفیت نہیں تو آپ کا ربط باہمی محض فکری اور میکانکی ہے۔ اس سے میکانکی نتائج تو مرتب ہو سکتے ہیں۔ قلب و نظر میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچیئے کہ آپ جو قرآنی رابطہ کی بنا پر ایک گروپ بننے کے مدعی ہیں، آپ کا یہ رابطہ کس زمرے میں آتا ہے؟ —— قلبی یا محض میکانکی؟

مجھے اس کا علم و احساس ہے کہ آپ احباب جو فکری طور پر اس تنظیم سے وابستہ ہوئے ہیں، تو آپ نے تقلیداً ایسا نہیں کیا۔ آپ نے پورے غور و خوض کے بعد اپنی سابقہ (غلط) روشوں کو چھوڑ کر علیٰ وجہ البصیرت اس راستے کو اختیار کیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کا ہر قدم یہ آواز دیتا ہے کہ:

حرم کو چھوڑ کے پھر حرم کہاں جاؤں　　کہ میں تو دیر و کلیسا سے ہو کے آیا ہوں

اس کے باوجود یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اس فکری راستہ سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں —— یہ بھی دیکھیں کہ آپ کی سیرت و کردار میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر آپ کے قلوب ایک دوسرے سے جڑ گئے ہیں تو پھر سمجھئے کہ قرآنی رابطہ کا مقصد پورا ہوا ہے، ورنہ نہیں۔

لیکن اس کے بعد بھی آپ یہ نہ سمجھ لیجیئے گا کہ آپ باقی مسلمانوں سے الگ کوئی ممتاز افراد بن گئے ہیں — یاد رکھیئے۔ اپنے آپ کو "حقیقی" اور دوسروں کو "پیدائشی" مسلمان سمجھنا۔ یا اپنے آپ کو صالح اور باقی مسلمانوں کو غیر صالح قرار دینا، انانیت کے نفسیاتی مرض کا مظہر ہے جو احساسِ کمتری سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ـــــ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۔ (۵۳/۳۲)

اپنے آپ کو یونہی مزکّی نہ سمجھ لیا کرو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اپنے آپ کو پستیوں میں گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو الیخ کے اس قسم کے وساس سے محفوظ رکھے۔ آپ کی سیرت و کردار کو ایسا ہونا چاہیئے جس سے دنیا خود اندازہ لگالے کہ آپ کیسے ہیں۔

فکری وحدت کے ساتھ جذباتی وحدت کی یہ نے جو اسکیم سوچی ہے آپ میں ایک عرصہ سے قوم کے سامنے پیش کرتا چلا آرہا ہوں۔ یعنی قرآنک ریسرچ سنٹر اور قرآنک درس گاہ کا قیام۔ ریسرچ سنٹر، قرآنی حقائق کی فکری تحقیق کا فریضہ سرانجام دے گا۔ جہاں تک قرآنی درس گاہ کا تعلق ہے، اس میں نصاب کے ہر مضمون پر قرآنی روشنی میں تنقید سے، حق و باطل کو نکھار کر الگ الگ کیا جائے گا لیکن اس کا مقصد اسی پر ختم نہیں ہو جائے گا۔ ان طالب علموں کی تربیت قرآنی روشنی میں اس طرح کی جائے گی کہ قرآنی اقدار ان کے قلب کی آواز بن جائیں اور جب یہ اقدار ہر طالب علم کے دل کی گہرائیوں سے ابھریں گی تو اس سے ان میں قلبی یا جذباتی وحدت پیدا ہو جائے گی۔ قرآن کریم اسے اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ سے تعبیر کرتا ہے اس سے (مجھے امید ہے کہ) قرآنی سانچوں میں ڈھلے ہوئے وہ انسان میسر آجائیں گے جن کی دنیا کو تلاش ہے۔

یہ بہرحال میری سکیم اور آرزو ہے۔ اس سکیم کی کامیابی اور میری اس آرزو کی برومندی کا انحصار توفیق ایزدی پہ ہے۔ میرا فریضہ بہرحال اس کے لئے کوشش کرنا ہے۔ سو وہ میں (بعونہٖ تعالیٰ) کئے جاؤں گا ـــــ اور اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی۔

یہ اسکیم جن مراحل سے گذری ہے اور اس وقت جس منزل میں ہے، اس کی تفصیل، سیکرٹری احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے اس بیان میں ملے گی جو طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مراحل بڑے صبر آزما ہیں لیکن میں ان کا عادی ہوں، اس لئے مایوس نہیں۔ میرا فریضہ اپنی امکانی حد تک کوشش کئے جانا ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ؕ

ـــــ (۰) ـــــ